''پرومیتھیس ایسلیپ! پرومیتھیس ایسلیپ! ایلن نے وحید کے گالوں کو تھپتھپایا۔'' دیکھو کیسا سہانا موسم ہے۔ ابابیلوں کی آوازیں سنتے ہو! ابھی بارش ہوگی۔ ذرا سی دیر میں جل تھل ہو جائے گا۔ اٹھو، چتلی کے بچھڑے کو دودھ پلائیں۔ اگر وہ آج بھی بھوکا رہا تو شام تک مر جائے گا اور پھر دیکھنا تمھاری۔۔۔۔ لو اب اٹھو بھی۔ خدا کے لیے اتنی دیر تک نہ سویا کرو، چندا۔''

وحید نے گل بیاں ڈال کر پوچھا۔'' پھر دیکھنا تمھاری۔۔۔۔ کیا؟''

ایلن نے جواب دیا۔'' کچھ نہیں۔''

وحید نے اسے زور سے بھینچ کر کہا۔'' کچھ تو ہے۔۔۔ اچھا جب تک تم بتاؤ گی نہیں ہم چھوڑیں گے نہیں۔''

''تمھاری شامت آئے گی۔ بابا پوچھیں گے تمھیں کس استاد نے یہ سبق پڑھایا ہے کہ بچھڑوں کو تھنوں سے دودھ نہیں پینے دیتے۔''

''ٹھیک ہے شامت تو آئے گی اور جب اس کا آنا لازمی ہے تو ہم تردّد کیوں کریں۔ آؤ ایک بار پھر سو جائیں۔ جب دوبارہ اُٹھیں گے تو شامت آ کر چلی بھی گئی ہوگی۔''

ایلن نے شال پرے کھینچ کر کہا۔''نہیں بھئی اُٹھو۔ اب میں تمھیں سونے نہ دوں گی۔''

ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا روشندانوں سے اندر گھس آیا اور باہر ٹپاٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔

''موسم تمھارے ساتھ ہے۔'' ایلن نے مسکرا کر کہا اور اسے پھر شال اڑھا دی خود اُٹھی۔ صلیب کو گریبان میں ڈال کر سنہرے بالوں پر برش پھیرا اور برآمدے والا دروازہ کھول کر چوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ سامنے رہٹ سے کمالو''اجالا'' کو کھول رہا تھا اور بابا مسعود کو کندھوں پر اُٹھائے بھاگا آ رہا تھا۔ بابا کی پگڑی مسعود کے سر پر تھی اور اس کا کھیس مسعود کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ ایلن نے ممتا بھری نظروں سے ادھر دیکھا اور پلٹ کر وحید سے پوچھا۔''تمھارے دیس میں سارے دادے اپنے پوتوں سے کیا ایسا ہی پیار کرتے ہیں؟''

''ہوں'' وحید نے تکیہ کے نیچے ہاتھ پھیر کر سگریٹ کیس ٹٹولا اور دیا سلائی جلا کر کہنے لگا۔''یہاں مول سے بیاج زیادہ پیارا ہوتا ہے۔''

جب وحید نے سر کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا تو وہ چپ چاپ اس کے قریب آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور باہر برستی ہوئی شفاف بوندوں کو اپنی الماسی آنکھوں میں بلاوے دیتی ہوئی سرگوشی کرنے لگی۔''ایسے ہی ایک دن تم ابنگڈن آئے تھے۔ سارے قصبہ پر کہر کی چادریں چڑیں ہوئی تھیں اور شمال میں زرد کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ اس دن خواہ مخواہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ مجھے ڈر لگے اور میں اپنے کمرے میں سفید موم بتی جلا کر بائیبل چوم کر کھولوں اور پھر اسے اپنے گھٹنوں پر ڈال کر یہ سوچنے لگوں کہ اگر اس خوف میں ذرا سا اضافہ اور ہو جائے تو یہ لمحے کتنے پیارے ہو جائیں۔۔۔۔ اور پھر ایک دن ہم جہاز میں سوار ہوئے تھے جو بہت سی مصنوعات اور ہندوستانی طالب علم لے کر بمبئی جا رہا تھا۔ اگر اس دن میں تمھارے ساتھ نہ آتی تو پتہ نہیں تم اکیلے کہاں مارے مارے پھرتے اور اب جب کہ میں یہاں پہنچ گئی ہوں۔ معلوم نہیں میرے ماں باپ کس حالت میں ہیں۔ ابنگڈن میں سینٹ نکولاس۔۔۔ نکولاس''۔۔۔ وہ وحید کی گود میں گر گئی اور بارش کی

شفاف بوندیں جنھیں اُس نے ابھی بلاوا دیا تھا اُس کی آنکھوں سے برسنے لگیں۔ وحید نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک منٹ کے لیے نگاہیں ادھر سے پھیر کر اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور اس کا کندھا تھپتھپایا۔ لیکن جب ہلکی ہلکی سسکیوں سے ایلن کا جسم چھوٹے چھوٹے ہلکورے کھانے لگا تو وحید نے سگریٹ پرے پھینک کر اس کے چہرے سے سنہرے بالوں کو پیچھے ہٹا کر دیکھا۔ برّاق نگینے اس کے گوشۂ جسم سے پھسل کر ناک کی پھننگ پر ذرا سی دیر کے لیے ٹھیرتے، پھر اس کی کلائی کے گرد لپٹی ہوئی سونے کی زنجیر کے حلقوں میں جذب ہو جاتے۔ وحید نے ایک دم اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے کندھے پر ٹھوڑی رگڑ کو کہنے لگا۔ ''اچھا! اچھا! ہم پھر ابنگڈن چلیں گے۔ پاپا سے ملیں گے۔ جوزف سے ملیں گے اور تمھارے سپنیل کو ساتھ لے کر آئیں گے۔'' لیکن ایلن کی سانس میں ہچکیوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سانس سیٹیاں بجاتی رہی۔ پھر وحید نے کچھ نہ کہا، نہ اپنی گرفت سخت کی۔ اُسے معلوم تھا کہ ذرا سی ہمدردی بھی اس مون سون کے راستہ میں اُونچا پہاڑ بن جائے گی۔

۔۔۔۔۔۔ اور شام تک اندر باہر ایسے ہی بارش ہوتی رہی۔

اپنا اچھا بھلا سلگتا ہوا حقہ چھوڑ کر بابا چارپائی سے دبے پاؤں اُٹھا اور سجاول جولاہے کے گھر جا کر محفل میں شریک ہو گیا۔ یہی باتیں تھیں جن سے وحید چڑتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ دبے پاؤں یاروں کی محفل میں پہنچا تھا۔ کمالو نے کہا۔ ''چاچا وحید بھائی کو پتہ لگ گیا تو بہت برہم ہوگا اور جب تیرے ساتھ ایسی ویسی قانونی بات کرنے لگتا ہے تو قسم قرآن شریف کی مجھے تاؤ آجاتا ہے۔''

چاچا نے کہا۔ ''ابے جا بیٹھ! تو کیا جانے بیٹے کیا ہوتے ہیں۔ ذرا اپنا مقدر تو بنوالا ایسی باتیں سننے کے لیے۔''

سائیں نے کہا۔ ''چاچا یہ تو بلینڈا ہے بلینڈا۔ اور پھر اس کا دماغ تم جانو یہاں ہوتا ہے یہاں۔'' اس نے ٹخنے پر ہاتھ مار کر کہا۔

چاچا نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے سجاول کو ٹھوکا دیا۔ ''میں پوچھوں شیخ نمازی یہ آج کیوں چپ سادھ رکھی ہے۔ کیا آج پیٹے کا سوت دینے آئی پشنک مار گئی؟''

سجاول ہنسا اور حقہ کی منہال کے گرد ہاتھ رکھ کر ایک لمبا کش لگایا۔ آنکھیں بند کر کے دھواں چھوڑتے ہوئے ایک بار وہ پھر ہنسا اور چاچا سے کہنے لگا۔ ''حضرت وارث شاہ واقعی ولی تھا اور اگر نہیں تھا تو معلوم ہوتا ہے اُسے بھی کسی ایسی ہی سے پالا پڑا ہوگا۔''

سائیں نے کہا۔ ''شیخ جی یہ چوڑے والیاں سب کو ولی بنا دیتی ہیں۔ ہم بھی ان کا جھوٹا کھا چکے ہیں اور سچ پوچھو تو یہ جوگ انھی کی دین ہے۔''

چاچا نے کہا۔ ''ہاں بھئی ٹھیک ہوگا۔ پر میں نے ایسے سارے ولیوں کو گل جندڑے پہنے ہوئے ہی دیکھا۔ اچھے اچھے جمالی خربوزے جھونج ہو کے رہ گئے۔ بھی شاید انھیں اللہ نظر بھی آیا ہو۔ پر ہم نے تو دیکھا نہیں۔''

اس پر کمالو ہنسا۔ اسے نہر کنارے والا قصہ یاد آ گیا۔ جب صوباں کے بھائیوں نے سائیں کو مرغا بنا کر پیٹا تھا اور اس کی پیٹھ پر کھونسڑے مار مار کر پوچھتے تھے۔ ''کیوں سائیں ڈھولا کوئی طبق روشن ہوا؟''

چاچا نے جھوٹ موٹ غصے ہو کر کہا۔ ''ابے اپنے آپ ہنسے جا رہا ہے۔ جا! جا کے کدال سے فصد کھلوا، پھر آ بیٹھک میں۔ تجھے تو

حقہ پینا بھی نہیں آتا۔۔۔۔"

سجاول نے رونکھے ہو کر کہا۔"جب یہ کش کھینچتا ہے تو قسم ہے پیدا کرنے والے کی کہ میرا کلیجہ سلگنے لگتا ہے۔۔۔اگلے لوگوں کے بھی کیا نکتے نکالے تھے کہ چاریاری میں حقہ پینے والا کرموں سے ملتا ہے۔ابھی دو منٹ کی بات ہے حقہ ٹکے گن رہا تھا اور اب کیا گپت ہو گیا ہے۔"

کمالو کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ چاچا نے آہستہ سے کہا۔"یار بچھیری، مجھے بھی پسند ہے مگر سالی کے بھونری ہے۔ڈر لگتا ہے کہیں وحید اسے خرید ہی نہ لے،کل سے اُس کے دل چڑھی ہوئی ہے۔"

سجاول نے کہا۔"نا چاچا، گولی مار ایسی بچھیری کے، تیرے گھر چاند سا پوتا ہے۔بھونری والی گھوڑی لا کے۔۔۔۔۔نا! نا! ایسا کام نہ کرنا۔"

کمالو بولا۔"چاچا، بات تو شیخ نمازی کی سولہ آنے کھری ہے۔۔۔بڑے میاں جی بھی کہا کرتے تھے کہ بھونری والا گھوڑا ہرے کھیت سے گذر جائے تو کال پڑ جاتا ہے اور یہ تو۔۔۔۔۔"

چاچا نے جواب دیا۔"مصیبت تو یہی ہے۔وحید میری بات نہیں مانے گا۔اور اس کی وہ میم، وہ تو ایسی باتوں میں اعتقاد ہی نہیں رکھتی اور یقین کرنا اس وقت ان تولی دھرتی پر بیٹھا ہوں۔اُسے مسعود سے بھی محبت نہیں۔"

"بالکل! بالکل! سائیں بنکارا" چاچا جیسے ان انگریزوں کے رنگ صاف ہوتے ہیں ویسے ہی ان کے دل۔"

چاچا نے سنی ان سنی کر کے کہا۔"کل صبح میں مسعود کو کپڑ چھان کر کے کانجی کا گلاس پلا رہا تھا کہ اوپر سے پہنچ گئی اور تنک کر بولی۔"بابا کیا کرتے ہو۔ماسود بس دودھ پیے گا۔اسے اور کچھ مت دیا کرو۔"

"لو شیخ جی، یہ کانجی بھی آج دھتورہ ہو گئی۔" اور پیشتر اس کے کہ شیخ جی جواب دیتے۔چاچا نے پھر کہنا شروع کیا۔"پتہ نہیں اتنے سال ولایت رہ کر بھی وحید ویسے کا ویسا کیوں رہا۔میں نے تو ڈاکٹری پڑھنے بھیجا تھا مگر وہ دنیا جہان کا زمیندارہ پاس کر کے آ گیا اور میم بھی ایسی چھانٹ کر نکالی جسے سوائے زمانے کے الٹا چلنے کے دوسرا کام ہی نہیں۔کل میں نے وحید سے کہا کہ گھوڑی کو بچہ دیے نو دن ہو چکے ہیں۔اسے پھر بھرا لو۔ایک بچہ اور دے دے گی تو پیسے پورے ہو جائیں گے۔وہ بھی پاس تھی۔پہلے انگریزی میں اس سے کچھ گٹ پٹ کی۔پھر مجھ سے کہنے لگی۔"نا بابا ایسا مت کرنا۔ابھی اسے ایک سال آرام دیں گے۔پھر اگلا بچہ لیں گے۔میں نے کہا۔"مستری حیات کو کہلوا بھیجو کہ اس کے لیے ایک پلنگ بھی بنا دے۔۔۔۔اور اس کے سوا میں کہہ بھی کیا سکتا تھا، سائیں؟"

"ٹھیک! ٹھیک!" سائیں نے حقہ پیتے ہوئے فلسیفانہ انداز میں سر ہلایا اور دیر تک اسی طرح ہلاتا رہا۔

اس دن جب وحید ڈسک کلیٹو ٹیر پر بیٹھا گھوڑوں کو کھیت میں چلا رہا تھا۔تو ایلن نے ساتھ چلتے ہوئے یہ شکایت کی کہ وہ ہر بار پچی ہی کے چابک لگاتا ہے حالانکہ اس کی رفتار اجالا سے کہیں تیز ہے۔ایلن نے کہا۔"مرد لوگ بڑے متعصب ہوتے ہیں کہ عورتوں کے علاوہ گھوڑیوں پر بھی ظلم کر کے خوش ہوتے ہیں حالانکہ عورتیں انھیں اندھیری راتوں میں بپھرے ہوئے دریاؤں کی لہروں میں کچے گھڑوں پر تیر

کر ملنے آتی رہی ہیں۔"

وحید نے غیر ارادی طور گھوڑوں کی راسیں کھینچ لیں اور متحیر ہو کر بولا۔ "تمھیں یہ کس نے بتایا، ایلن؟"

"چلو! چلو! ایلن نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔" گھوڑوں کو نہ روکو۔ میں تمھیں ساری کہانی سناؤں گی۔ پھر تم ہی فیصلہ کرنا مہینوال بہادر تھا یا سوہنی۔ گو کہانی سنانے والی شروع سے آخر تک مہینوال ہی کی تعریف کرتی رہی مگر میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

ایلن نے اپنی کمر پر لٹکتے ہوئے تنکوں کے بڑے ٹوپ کو طلوع ہوتے سورج کی کرنوں کے مخالف اپنے سر پر جما لیا اور کہانی سنانے لگی۔ وحید نے رفتار ہلکی کر دی۔ گھوڑے قدم قدم چلنے لگے اور مشین کی تیز دھار تھالیاں زمین کا سینہ میں آہستہ آہستہ شانہ کرنے لگیں۔ راستہ چلتے چلتے جب کبھی ایلن کا پاؤں کسی اونچی نیچی جگہ پر آجاتا تو وہ کمان کی طرح ایک طرف جھک جاتی اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہیٹ کا نیلگوں ربن جھکورے لے لے کر ادھر اُدھر سے اس کی گردن چومنے لگتا۔ اور اس کے خاکستری فل بوٹ جن میں اُس نے اپنی براؤن پتلون ٹھونس رکھی تھی۔ چرمر چرمر کرتے اور پنجابی داستانِ عشق میں سسکیاں بھرتے معلوم ہوتے۔ چڑھی ہوئی آستینوں سے میدہ اور شہاب بازو دھول کی ہلکی سی تہ سے شربتی ہو رہے تھے۔ جب ایلن کہانی سنا چکی تو وحید نے ہل روک کر اپنا دایاں گال کھڑے زانوں پر آرام سے ٹکا دیا اور ایک آنکھ میچ کر پوچھنے لگا۔" یہ تو سب کچھ ہوا۔ لیکن تم نے مرزا کی رودادِ الفت بھی سنی؟ شمع محبت کے یہ دو پروانے تھے جن کی الفت پر جسم غالب آ گیا اور ان سے ایسی بھول ہو گئی جسے آج تک سب نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ افلاک سے اب عشق کا نزول بند ہو گیا ہے۔

ایلن نے کہا۔" ڈارلنگ، مجھے یہ کہانی ضرور سناؤ۔۔۔ ابھی اس قصے کو شروع کر دو۔ میں تمھارے ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔"

وحید نے راسیں سنبھالیں اور گھوڑوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ لیکن ابھی انہوں نے پہلا قدم اُٹھایا تھا کہ نہر کے کنارے نیم کے بڑے پیڑ تلے مسعود نے منہ کے آگے مٹھی رکھ کر اُونچی لے میں پکارا۔۔۔" ڈا۔۔۔ ڈا۔۔۔ مامی!"

انھوں نے ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نیم کے پاس ایک بڑی سی خوبصورت کار کھڑی تھی اور اس کے پاس دو تین آدمی کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ وحید کلیٹو یٹر سے کود کر اُترا۔ ایلن نے اپنا ہیٹ پھر پیچھے گرا دیا اور دونوں تیز تیز قدم اُٹھاتے نہر کے کنارے پہنچ گئے۔

مسعود نے ہاتھ آگے پھیلا کر کہا۔" ڈیڈی، ان کا موٹر خراب ہو گیا ہے۔ تم ٹھیک کر دو۔" اس پر مسکراتا ہوا ایک انگریز آگے بڑھا اور اس نے کہا۔" میرا نام بٹر ہے۔ میں اس علاقے کا ایکس۔ ای۔ این ہوں۔ اس وقت دورے پر جا رہا تھا کہ موٹر میں کچھ خرابی ہو گئی۔ ڈرائیور ٹھیک کر رہا ہے۔ اور ننھے میاں نے بغیر ہمیں پوچھے آپ کو بلانا شروع کر دیا۔"

وحید نے اپنی بیوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔" یہ ایلن ہے۔ اس کے والد ابنگڈن کے کاٹج ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں اور اس بھائی جوزف لندن میڈیکل کالج مین میرا ہم جماعت تھا۔ ہم دونوں کو زراعت پسند ہے اور ہم نے اپنی آبائی زمین کو جدید طریقے پر کاشت کرنا شروع کیا ہے۔

بٹر نے کہا۔ ''اینگڈن میں ایک مرتبہ میں بھی گیا تھا۔ وہاں میرا دوست کلارک رہتا ہے۔''

ایلن نے بات کاٹ کر کہا۔ ''ہاں، ہاں! میں اسے جانتی ہوں۔ اس کے پاس بہت سے اچھے اچھے گھوڑے ہیں اور اس کے مشکی ''سنڈباڈ'' کو اول نمبر کا انعام بھی مل چکا ہے۔ انگلستان میں اس سے بہتر نسل کا کلیولینڈ بے سٹالین اور کہیں نہیں۔''

بٹر نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''بالکل ٹھیک۔ وہی گھوڑوں والا کلارک میرا دوست ہے۔ میں گھوڑوں کے میلے پر پورا ایک ہفتہ اس کے یہاں مہمان رہا۔

وحید نے کہا۔ ''جب تک موٹر بنتا ہے آپ ہمارے مہمان رہیے۔ میں آپ کو ایلن کا باغیچہ اور مرغی خانہ دکھاتا ہوں۔''

بٹر ان کے ساتھ ہولیا۔

اُونچی پٹڑی سے اترتے ہوئے مسعود نے کہا۔ ''تیتریاں اور بطخیں میری ہیں اور مرغیاں ممی کی۔''

لیکن بٹر نے یہ فقرہ نہیں سنا۔ وہ ایلن کے ساتھ آدمیوں کے متعلق باتیں کر رہا تھا جنہیں وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے۔

مرغی خانے کے باہر بابا دیوار میں کیل ٹھونک کر رسی باندھ رہا تھا۔ وحید نے بٹر سے کہا۔ ''یہ میرے والد ہیں اور میں نے اس فارم کا نام انہی کے نام پر رکھا ہے۔''

بٹر نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بابا کو سلام کیا اور مرغی خانہ کے اندر داخل ہو گیا۔

ایلن نے ایک بند پٹ کھولتے ہوئے کہا۔ ''بابا ذرا کھیت جایئے۔ ہم اجالا اور پچی کو اسی طرح چھوڑ آئے ہیں۔ انھیں ہل سے کھول کر شیشم تلے باندھ آیئے۔ کہیں ڈر کر خود کو زخمی نہ کر بیٹھیں۔

بابا بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

وحید نے کہا۔ ''یہ ریڈ روڈ کا ڈبہ ہے۔ ابھی پچھلے ہفتہ کڑک ہوئی ہے۔ ہر صبح اتنا بڑا انڈا دیا کرتی تھی۔'' اس نے انگلیاں پھیلا کر کہا۔ ''لیکن کسی ناشتہ پر بھی ہمیں یہ انڈا نہیں ملا۔ اب ان سے بچے نکلیں گے تو شاید''۔۔۔۔ پھر وہ ایلن کی طرف دیکھ کر ہنسا جس نے جواب کے طور پر مسکرا کر سر ہلانا ہی کافی سمجھا۔ لیگ ہارن اور منارکہ مرغیوں کے ڈربے علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان پر ہر مرغی کا نام کوئلے سے لکھا تھا۔ انڈا دینے کی جگہ مشترکہ تھی۔ جہاں گھاس پھونس کے بہت سے گھونسلے بنے ہوئے تھے۔ جس مرغی کو انڈا دینے کی حاجت محسوس ہوتی ایک گھونسلے میں جا کر چپ چاپ بیٹھ جاتی۔

مرغی خانے کی کھڑکی میں سے چتلی کو دیکھ کر بٹر نے پوچھا۔ یہ گائے آپ نے کہاں سے لی؟'' اس کا بچہ نر ہے یا مادہ؟''

ایلن نے جواب دیا۔ ''نر۔۔۔ نر نہ بھی ہوتا تو بھی ہم اسے کسی کو نہ دیتے۔ مجھے احساس ہے کہ ہم اس معاملے میں بہت ہی متعصب ہیں۔''

اس پر سب ہنسنے لگے اور مسعود حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا کہ ایسی ہنسی کی بات ہی کب ہوئی تھی!

جب وہ باہر نکلے تو آسمان پر اودے اور کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کیکر کے درختوں تلے بکریاں چر رہی تھیں اور ان

کے قریب ہی سبز سبز مخملی گھاس پر چتلی گردن جھکائے اپنے بچے کو چاٹ رہی تھی جو اپنے کان جھٹک کر بار بار اُٹھنے کی کوشش کرتا مگر اُٹھ نہ سکتا تھا۔ بچہ پیدائش سے گائے کی ہڈیاں موترے نکل آئے تھے اور اس کا دودھ سے بھرا لیوا پچھلی ٹانگوں میں مشکیزے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ چتلی کی اگلی ٹانگیں گھٹنوں تک سفید تھیں اور اس کے گلے کے نیچے سرمئی رنگ کی جھالر دبیز ریشمی پرچم کی طرح بل کھا رہی تھی۔ ان لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ زور سے ڈکرائی اور پھر نوکِ زبان سے اپنے نتھنوں کو صاف کرنے لگی۔

گھاٹی پر چڑھتے ہوئے بٹر نے پوچھا کہ انھوں نے اصطبل اس قدر اُونچا بنانے کی کیوں سوچی تو وحید نے کہا۔ ''گھوڑے چڑھائی چڑھتے اور اترائی اترتے بڑے خوب صورت لگتے ہیں۔ جب ان کے بڑے بڑے ساغری سم زمین پر پڑتے ہیں تو گامچیاں نہایت لچکیلے انداز میں جھٹکے کھاتی ہیں اور ان کی گردنیں غیر معمولی طور پر اوپر نیچے ہلنے سے اپنی چمک دار اور سڈول مچھلیوں کی نمائش اچھی طرح سے کر سکتی ہیں اور صبح صبح جب ایلن اصطبل کا دروازہ کھولتی ہے تو میں اپنے دریچے اس اجالا اور بچی کو نیچے اترتے دیکھتا ہوں۔ قدم تول تول کر رکھنے کی وجہ سے ان کی ایالیں ایسے ہلتی ہیں جیسے کوٹھے پر کنگھی کرتی ہوئی کوئی لڑکی نیچے صحن میں کسی کی آواز سن کر ہچکچاتی ہوئی جلدی جلدی سیڑھیاں اُترے۔

بٹر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''معلوم ہوتا ہے آپ لوگ کاشت کم کرتے ہیں اور شاعری زیادہ۔''

ایلن نے بھویں اُوپر اُٹھا کر کہا۔ ''بالکل! بالکل! یہ بہت سست ہیں۔ دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ اپنے فن کو عروج پر پہنچاتے اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے۔۔۔۔ مسٹر بٹر، میرے خاوند ایف۔ آر۔ سی۔ ایس ہیں اور بجائے آپریشن کرنے کے زمین کھود کر آلو نکالتے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ بابا جب انھیں ہل پر بیٹھے گھوڑوں کو ٹخ ٹخ کرتے دیکھتا ہے تو خون کے آنسو پی کر رہ جاتا ہے۔ اس کا اس دنیا میں سوائے اس بیٹے کے اور کوئی نہیں۔ اپنی آبائی زمین کا بیشتر حصہ بیچ کر اس نے انھیں ولایت بھیجا۔ ان کی خوشنودی کے لیے مجھ سے شادی کرنے کی اجازت دی اور جب یہ تعلیم سے فارغ ہو کر لوٹے تو نوکری سے انکار کر کے بابا کے ارمانوں کا خون کر دیا اور آتے ہی اس جدی پیشے کو سینے سے لگا لیا۔ فرق صرف اتنا ہے، بابا بیلوں سے ہل جوتتا تھا تو یہ گھوڑوں سے کاشت کرتے ہیں۔ پتہ نہیں انہیں۔۔۔۔ پہلے تو میری ہر بات مانتے تھے پر!۔۔۔۔۔!۔۔۔''

''اب بھی مانتے ہیں ایلن اب بھی۔۔۔۔'' وحید نے میٹھی نگاہوں سے اسے دیکھا اور معذوری کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''پر اب نوکری نہیں ملتی اور پھر وہ فوجی نوکری جو تمھیں پسند ہے اب کہاں۔ اب تو جنگ ختم ہونے والی ہے اور بھرتی بھی بند ہے۔ جب ایسی نوکری ملے گی ضرور کریں گے۔۔۔۔ یہ ہمارا وعدہ رہا۔''

بٹر نے کہا۔ ''بیویوں کے دل میں جو پیاری پیاری تمنائیں کروٹیں لیتی رہتی ہیں انھیں پورا کرنا ہی چاہیے۔ بابا کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ خود مجھے اپنے باپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن آپکی مسز کے بارے میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ انھیں سنہری سپنے بننے کے لیے دھاگے اور مقیش لا ہی دیجیے۔۔۔۔ اور اگر آپ کو نوکری مل جائے مسٹر وحید۔۔۔ تو آپ کریں گے؟''

وحید نے وثوق سے کہا۔ ''کیوں نہیں؟ لیکن وہ ایلن کی مرضی کے مطابق ہو۔''

گارے اور بے ڈول پتھروں کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے بٹر نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

ایلن نے جواب دیا۔ ''یہ ہماری سمتھی ہے۔ جب ہل کا کوئی پرزہ خراب ہو جاتا ہے یا چھکڑے کے دُھرا اُتر جاتے ہیں تو ہم یہاں ان کی مرمت کیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ آیئے میں آپ کو ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی نعل دکھاوں۔ ہم نعل بندی بھی خود ہی کیا کرتے ہیں۔''

نیچے اُترتے ہوئے وحید نے کہا۔ ''دیسی گھوڑے بڑی مصیبت ہوتے ہیں۔ آپ نے ہماری یہ مریل تیکھی کنوتیوں والی گھوڑی دیکھی ہے نا۔ ہم آج تک بغیر پرنال کے اسے نعل نہیں لگا سکے اور وہ اتنے گرانڈیل تھارو بریڈ گھوڑے اس طرح سم اُٹھائے رکھتے ہیں جیسے مہندی لگائی جا رہی ہو۔''

ایلن نے کہا۔ ''بابا کی کہنی پر ایک ہٹیلا مسا ہے۔ وہ ہر ہفتے اُسے گھوڑے کی دم کے بال سے کاٹتے ہیں وہ پھر نمودار ہو جاتا ہے اور پتہ ہے ان کی ڈاکٹری کون کرتا ہے؟ ماسود! جس صبح بابا اپنی کہنی کھول کر بیٹھ جاتے ہیں یہ پاس آ کر پوچھتا ہے۔ ''بابا، بال لاؤں۔'' اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اجالا اور بچی کی دم سے بال یوں نوچتا ہے جیسے دیوار چڑھی بیل کھسوٹ رہا ہو۔''

موٹر ٹھیک ہو گیا اور بٹر ان سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے روانہ ہو گیا۔ درخت سے بندھے ہوئے موم جامہ میں مسعود کو لٹا کر وہ پھر کھیت میں آ گئے۔ ایلن نے کہا۔ ''ایک تو میں تھک گئی ہوں۔ دوسرے شاید تمھارے نوکر ہو جانے کے بعد سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑے۔ اس لیے کیوں نہ میں ہی کلیٹو یٹر چلاؤں۔''

جب ہل چلا اور تیز کناروں والے تولے گھومنے لگے تو وحید نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا، مرزا اور صاحباں ویسے نکلے۔ ورنہ اس دنیا میں ابھی اور بہت سے لیلیٰ مجنوں اور رومیو جولیٹ پیدا ہوتے۔''

مسعود دن بھر سویا رہا تھا۔ اس لیے اب بابا کے ساتھ والی چارپائی پر لیٹا مزے لے لے کر سوال کر رہا تھا۔ ''بابا! تارے رات کو کیوں نکلتے ہیں۔ دن کو کیوں نہیں نکلتے؟''

''دن کو نہیں نکلتے بیٹا۔'' بابا نے سمجھا کر کہا۔

مسعود نے کہا۔ ''اچھا!۔۔۔ بابا ہماری بیری کے پتے ہرے کیوں ہیں؟''

''پتے ہرے ہی ہوتے ہیں، بیٹا۔'' بابا نے بنا تات کا قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

مسعود نے پھر پوچھا۔ ''بابا گھوڑے ہرے کیوں نہیں ہوتے؟''

کمالو جو چارپائی کی ادوائن کس رہا تھا زور سے ہنس پڑا۔ ''جو ہوا گھوڑا وہ ہرا کیسے ہو گا؟''

مسعود نے مڑ کر اس کی طرف حیرت سے دیکھا تو بابا نے دھتکار کر کہا۔ ''لعنتی، جو بولے گا تو کفن ہی پھاڑے گا۔ جا جا۔۔۔ جا کے اپنی بیوی کو۔۔۔۔۔''

ایلن کو شام سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اسے شام کا وقت ایسے لگتا جیسے سفید برقعہ گھر میں دھو کر الگنی پر ڈالا ہوا ہو۔ میلا میلا مرا ہوا بگلا۔ لیکن یہ شام تو اس سے بھی سوا تھی۔ نہر کی پٹڑی پر موٹر چلاتے ہوئے اس نے وحید کو دیکھا جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا شیشے میں سے

سامنے دیکھ رہا تھا۔اس کے ہاتھ اس کی گود میں پڑے تھے اور آنکھیں ایک ہی جگہ ٹکٹکی باندھے کچھ نہ دیکھ رہی تھیں۔بھوؤں کے ذرا خمدار ہو جانے سے ناک کے دائیں بائیں جلد کھنچ سی گئی تھی اور ماتھے پر ایک سلوٹ اُبھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ایلن نے اس کے کان کے پیچھے تازہ حجامت میں دیرینہ زخم کا ایک چھوٹا سا نشان دیکھا جہاں بال نہیں اُگے تھے اور جس کے درمیان بہت سی باریک باریک جھریاں پڑی تھیں۔ایلن نے پہلے یہ زخم نہ دیکھا تھا اس لیے اسے بہت ہی عجیب سا لگا۔۔۔جب وحید اپنے خیال سے چونکا تو ایلن نے اپنی نگاہیں دُور تک لیٹے ہوئے ستواں راستے پر جما دیں اور اس طرف سے ایسے منہ پھیر لیا جیسے ادھر دیکھا ہی نہیں۔

اسٹیشن کے باہر اسٹیشن ماسٹر ان کا انتظار کر رہا تھا۔اس نے آگے بڑھ کر وحید سے مصافحہ کیا اور اپنی ٹوپی اتار کر ایلن کو سلام کیا۔

وحید نے مسکرا کر کہا۔''معاف کیجیے گا ہم ذرا جلدی آ گئے۔۔۔ایلن کا تقاضا تھا کہ ہم وقت سے پہلے پہنچیں تا کہ آپ کو سگنل نہ دینے کی دوبارہ تاکید کی جا سکے۔''اور اسٹیشن ماسٹر نے دونوں ہاتھ ہلا کر کہا۔''اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔آپ کا پیغام ہی میرے لیے کافی ہے۔لیکن آپ پہلے چلے آئے تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔''

وحید نے ماتھے کے قریب سیدھا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔''شکریہ!شکریہ!۔۔۔ایلن کا تو خیال تھا کہ یہ مجھے اگلے جنکشن پر چھوڑ آئے۔لیکن میں نہ مانا۔اس کی صحت دیکھیے۔دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے اور پھر ساٹھ میل کی ڈرائیونگ!مجھے یقین ہے بالکل نڈھال ہو جاتی۔''

اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔''بے شک!بے شک! لیکن جب تک میں یہاں ہوں آپ کو جنکشن پر جا کر گاڑی پکڑنے کا خیال بھی نہ لانا چاہیے۔کیا ہوا اگر دو تین منٹ میل یہاں ڈی ٹین ہو گئی۔آپ خاطر جمع رکھیں۔میں نے پوائنٹ مین سے کہہ دیا ہے کہ وہ آؤٹر سگنل نہ دے اور ٹوکن بھی دو شاخے پر اس انداز سے ٹکائے کہ لیا نہ جا سکے۔''

وحید نے سر ہلا کر کہا۔''بہت خوب!یہاں مجھے وہ قِصّہ یاد آ گیا ہے جب اکبر۔۔۔۔''

کنٹرول کی گھنٹی بجی اور اسٹیشن ماسٹر معذرت چاہتا ہوا اندر چلا گیا۔تھوڑی دیر تک کمرے سے باہر کسی بہرے کے ساتھ گفتگو کی آواز آتی رہی اور پھر بالوں پر ہاتھ پھیرتا اسٹیشن ماسٹر نمودار ہوا۔اس نے لب کھولے بغیر ناک سے''ہونہہ'' کر کے بتایا کہ میل پہلے ہی ایک گھنٹہ لیٹ آ رہی ہے۔

جب ایلن اور وحید کو چھوٹے سے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر اسٹیشن ماسٹر باہر نکلنے لگا تو اس نے دہلیز پر پیچھے گھوم کر وحید سے پوچھا۔'' معاف کیجیے گا میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ آپ اس طرح اچانک دلّی کیوں جا رہے ہیں؟''

''ماسٹر صاحب۔'' وحید اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔پھر اس نے پتلون سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور دروازے پر پہنچ کر اسٹیشن ماسٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایلن سے کہا''ایک منٹ ایلن''اور باہر نکل کر بولا۔''حکومت نے جبراً میری خدمات حاصل کی ہیں۔العرفہ کے فوجی ہسپتال میں ابھی بہت سے ایسے مریض ہیں جن کا آپریشن نہیں ہو سکا۔میجر گزور حرکتِ قلب بند ہو جانے سے مر گئے اور جن مریضوں کا آپریشن ہو چکا ہے۔ان کے معائنہ کے لیے کوئی موجود نہیں۔فی الحال نرسیں اور دوسرے ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔مجھے سیدھا

میجر کا رینک دے کر بھیجا جا رہا ہے۔ میں وہاں جانے سے اگر خوش نہیں تو ناخوش بھی نہیں ہوں۔ ایلن کی خوشی اسی میں ہے کہ میں ہل چھوڑ کر ایک بار پھر نشتر سنبھال لوں۔''

اسٹیشن ماسٹر نے پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہے ڈاکٹر صاحب۔ خلقِ خدا کا فائدہ ہے اور آپ کی شہرت۔''

وحید نے ایک لمبا کش چھوڑ کر کہا۔ ''ہاں شاید کچھ ایسا ہی ہے۔''

پھر وہ اندر آ کر سامنے گوان کے بیڈول میز کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ایلن اس کے پاس لمبے بینچ پر ٹانگیں رکھے بیٹھی تھی۔ اس کی کہنی میز کے کونے پر تھی اور دوسرا ہاتھ کمر کے پیچھے بنچ پر رکھا تھا جس پر اس نے اپنے جسم کا بوجھ ڈال رکھا تھا۔ گریبان کا اوپر والا بٹن کھلا تھا اور گلے کی نیلی نیلی رگیں مرمریں جلد میں چوڑیوں کے تاروں کی طرح خاموش پڑی تھیں۔ کنپٹیوں سے اُٹھے ہوئے سنہرے بالوں کے لچھے آہستہ آہستہ سانس لے رہے تھے۔ اور پرسکون پتلیوں کے پیچھے جھلملاتے آنسو کہہ رہے تھے کہ ایسی شاموں کو ہم چراغاں کیا کرتے ہیں۔ وحید نے میز سے اس کا بازو اُٹھا کر اس کی کلائی ہاتھ میں پکڑ لی اور انگلیوں کی پوروں کو لبوں سے لگایا۔

چھنگلیا نیچے مڑ گئی اور سیدھی انگلی آگے جھک گئی۔ درمیانی انگلی ہونٹ کے ایک کونے سے جا لگی اور ساتھ والی نے اُوپر کو ذرا اُونچا اٹھانا چاہا۔ ناخنوں سے کیلے کی خوشبو آ رہی تھی اور سانس میں چائے کی لپیٹ تھی۔

''ایلن''! وحید نے ہولے سے کہا اور اس نے اپنی ٹھوڑی اوپر اٹھا دی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دیپ جلا اور جھلملا گیا۔ پچھلی کہنی کے جوڑ سے ایک آواز نے پیدا ہونا چاہا لیکن رک گئی اور باچھوں کی قریبی قوسیں مستقیم ہو گئیں۔

وحید نے کہا۔ ''جب میں وہاں سے لوٹوں گا تو اینگڈن چلیں گے اور پھر ساری عمر وہیں رہیں گے۔۔۔ اور اپنے ساتھ بابا کو بھی لے چلیں گے۔ لیکن اب تم فکر نہ کرو میں کون سا محاذ پر چلا ہوں جو تم اس طرح بیٹھی ہو۔'' اس نے اپنا چہرہ ایلن کی پیشانی اور بالوں پر رکھ دیا اور پیار سے رگڑنے لگا۔

ایلن نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ ''اب تم جا رہے ہو تو میرا دل گھٹتا ہے۔ ہل چلاتے تھے تو میرا دل کڑھتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا تھا۔ تم ہمپسٹڈ میں تالاب کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک ہی بار مجھے دکھائی دیتے اور میں پانچ قدم چلنے کے بعد تمھارے متعلق سوچنا بند کر دیتی۔ یا اگر تم مجھے بار بار ملتے تو تمھارا دل اس طرح کا نہ ہوتا اور اگر تمھارا دل اسی طرح کا ہونا تھا تو قدرت نے مجھے عورت نہ بناتی۔ لیکن خیر! اب جو تم جا رہے ہو تو کبھی آؤ گے بھی پر اتنے سارے دن میں مرغیوں اور بطخوں سے کھیل کر نہیں گذار سکتی۔ مسعود کی شکل تمھاری یاد کو ابھارتی رہے گی اور بابا کی چال میں قدم قدم پر تم ٹہلتے نظر آؤ گے اور تمھاری غیر موجودگی میں تمھارے اس ہیولے سے کس طرح پیار کر سکوں گی؟ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر اس ایکس۔ ای۔ این کا موٹر خراب نہ ہوتا اور ہم اس سے نہ ملتے۔''

وحید نے میز سے اتر کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور جب ایلن نے اس کی آنکھوں میں دُور ایک لو ٹمٹماتی دیکھی تو وہ بے اختیار اس کے ساتھ چمٹ گئی۔

اسٹیشن کے چھوٹے سے پھاٹک سے باہر نکل کر اس نے اردگرد دیکھا اور اُسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے دل میں مچھلی کا کانٹا چبھو کر پوری قوت سے کھینچ رہا ہے۔ چاروں طرف دُور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں کہیں کہیں خمیدہ درخت سر جھکائے کھڑے تھے اور نیلے آسمان سے پیلی پیلی روشنی اتر رہی تھی۔ موٹر میں بیٹھ کر جب اس نے سلف دبایا تو ایک نظر ساتھ والی سیٹ کو دیکھا جس کی گدی پر زور سے ہاتھ مارنے سے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس پیلی روشنی کا غبار اوپر اچھلا ہے اور جیسے وحید کو اس سیٹ پر بیٹھے کتنے ہی سال گزر چکے ہیں۔ نہر کی پٹڑی پر جاتے ہوئے اس نے ایک دیہاتی جوڑے کو پانی میں پاؤں لٹکائے دیکھا جو جان بوجھ کر شرمیلی ہنسی ہنس رہے تھے۔ نہر کے دونوں کناروں پر گھاس اُگی ہوئی تھی مگر بعض جگہ ایک لمبا ٹکڑا بغیر گھاس کے بھی آجاتا جہاں مٹی کے بہت سے ان گھڑت ڈھیلے پڑے ہوتے۔ ان ڈھیلوں سے خاکستری فاختائیں شیں شیں کر کے اُڑتیں اور دُور دُور درختوں کی طرف پرواز کر جاتیں۔ نہر کے بیلدار کی جھونپڑی کے پاس اس نے موٹر روکی اور نہر کے کنارے جا بیٹھی۔ موٹے موٹے کھردرے ڈھیلوں کے درمیان اس نے چند سیلے سیلے ڈھیلوں کو دیکھا جب کی پیاس بجھ چکی تھی اور جنھوں نے پانی کا ایک قطرہ بھی واپس نہر میں نہیں جانے دیا تھا۔ سیلابی زمین پر ہاتھ رکھ کر اس نے سوچا کہ ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے وحید نے جاتے ہوئے یہاں منہ دھویا تھا اور ایک سگریٹ پیا تھا۔ اس جگہ نے وہ پانی پی لیا۔ وحید یہاں سے بہت دُور ہو گیا۔ نہر کا پانی بہت سا آگے نکل گیا اور جو پیچھے آرہا ہے وہ اور آگے نکل جائے گا اور وحید اور دُور ہو جائے گا۔ سر پھیر کر اس نے نہر کو دُور تک دیکھا اور یہ کہہ کر پھر موٹر میں آبیٹھی کہ جانے کے لیے پانی آرہا ہے۔

رات کو جب مسعود اس کے کمرے میں سونے آیا تو اس نے دکھی دل سے کہا۔ ''دیکھو، ماسود، تم ممی سے بالکل محبت نہیں کرتا۔''

''کرتا، ممی کرتا! مسعود نے ایلن کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

''اچھا بتاؤ تم کو بابا اچھا لگتا یا ممی؟''

مسعود سوچنے لگا۔

''جلدی بتاؤ، ماسود، نہیں تو ہم تم سے بولیں گے نہیں۔''

''ممی''

''اور بابا؟''

''بابا بھی۔''

''اور ڈآڈا!؟''

''ڈآڈا بھی، ممی ڈآڈا کہاں گئے؟''

''دُور گئے، ماسود۔۔۔ تم ان سے اتنا پیار کیا کرو۔'' اس نے باہیں کھول کر بتایا۔ ''اتنا! ڈآڈا سب سے اچھے، ممی اور بابا سے بھی۔ تمھارے کھلونوں سے بھی۔ تمھاری تیتریوں سے بھی۔ وہ تمھارے کھلونے لینے گئے ہیں۔ اچھے ہیں کہ نہیں ڈآڈا؟''

''ہاں، ممی۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا اور پھر غور کرنے لگا کہ ڈآڈا ہمارے ساتھ رہتے رہتے ایک دم چلے کیوں گئے اور چلے گئے

تو ہمیں یہاں چھوڑ گئے۔

ممّی کے بغیر اب وہ کھانا کس کے ساتھ کھائیں گے۔اجالا اور پچی کے بغیر وہ ہل کیسے جوتیں گے اور رات کو کسی کسے کیا کریں گے؟''

رات بھر وہ اپنی ممّی کے بازوؤں میں سویا رہا جو ساری رات جاگ کر اُسے چومتی رہی اور منہ میں گیت لوریاں اور نغمے گاتی رہی۔

صبح صبح بابا نے دروازے کو ٹھوکا۔''مسعود جاگ گیا ہو تو اسے بوٹ پہنا دو، ایلن اور تم ناشتہ تیار کر لو۔کافی دیر ہو گئی ہے۔بادلوں کی وجہ سے سورج کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔''

ایلن خاموشی سے اُٹھی، کھونٹی سے ایپرن اتار کر باندھا اور پچھلا دروازہ کھول کر باروچی خانہ میں چلی گئی۔جب مسعود کو گہری نیند سوتے دیکھا تو بابا نے دبے پاؤں باورچی خانہ میں جا کر حمام کے پاس کھڑا ہو گیا اور لجاجت سے بولا۔''مسعود ابھی جاگا تو نہیں۔''لیکن دیر سے اٹھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔کیا میں اسے جگا کر کنوئیں پر لے جاؤں؟''

ایلن نے بھولپن سے کہا۔'' آپ بھی کمال کرتے ہیں۔بابا مجھ سے اجازت مانگ رہے ہیں۔اپنے بیٹے کو جگانے کے لیے دوسروں سے نہیں پوچھنا چاہیے۔''

''اچھا! اچھا! بابا نے اس کی سعادت مندی سے خوش ہو کر کہا۔''میں اسے کنوئیں پر لے جا رہا ہوں۔آدھ گھنٹہ تک واپس آ جائیں گے۔تم سب سے پہلے مسعود کے لیے دودھ ابال رکھو۔''

جب وہ باورچی خانہ سے باہر نکلا تو اس نے سوچا کہ ایلن واقعی اچھی لڑکی ہے۔صرف میری وجہ سے مسعود کو زیادہ قریب نہیں رکھتی۔ورنہ کون ماں ہے جو اپنے بیٹے کو نہ چاہے۔''خدا کرے''اس نے دل ہی دل میں دعا دیتے ہو کہا۔''اس دفعہ بھی اس کے لڑکا ہی پیدا ہو اور وہ اس ننھے سے جی بھر کے پیار کر سکے۔''

دن ایک دوسرے کے پیچھے خزاں کے پتوں کی طرح گرتے چلے گئے۔کھیتی پک کر تیار ہو گئی۔فصل کاٹی گئی۔کھلیان دُور دور تک پھیل گئے۔تیتریوں نے ان میں جا کر انڈے بھی دے دیے اور مرغیاں موقع پا کر وہاں سے بھی رسد حاصل کرنے لگیں۔ریڈ روڈ کے بچے مرغیاں بن گئے۔چتلی کا بچھڑا اب کسی سے باندھا نہ جاتا تھا۔اور کاٹھیاواڑی گھوڑی اور اس کا بچھیرا سارا سارا دن ہری ہری دوب چرتے رہتے۔

بابا نے ایلن کو ہر قسم کا کام کرنے سے منع کر رکھا تھا۔مسعود اب پھر بابا کے پاس سونے لگا تھا۔ایلن صبح ٹوکری کے کر صرف مرغی خانے تک جاتی اور انڈے لے کر اور مرغیوں کے ڈربے صاف کر کے چلی آتی۔وحید کا خط ہر ہفتے آتا تھا۔ولایت سے جوزف کی چھٹی آئی تھی کہ ہم سب مسعود کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔تم لوگ بہار کے شروع میں ہمارے پاس ضرور آؤ۔ایلن نے اس خط کو بائیبل میں سنبھال کر رکھا تھا اور ہر صبح اس نکال کر ضرور پڑھتی تھی۔

صبح کھلیانوں کو گاہا جا رہا تھا اور کمالو ساتھ کے گاؤں آدمی لینے گیا ہوا تھا۔جب شام رات کی سرحدوں میں داخل ہو گئی اور کمالو نہ آیا

تو ایلن چپکے سے اُٹھی۔ بالٹی ہاتھ میں لٹکا کر اور چھوٹا سٹول بغل میں داب کر چتلی دوہنے طویلہ میں چلی گئی اور جب اس نے دودھ کی آخری بوند نچوڑی تو بادل زور سے گرجا اور بارش کے چھینٹے ایک دم دیواروں سے سر مارنے لگے۔ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی وہ باورچی خانہ میں پہنچی۔ دودھ کو چولھے پر رکھا ہی تھا کہ ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی کہ پانی کمروں میں گھسنے لگا۔ بابا اپنے کمرے سے ایلن کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں ٹخنے ٹخنے پانی دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ ایلن باورچی خانہ میں آگ کے سامنے سٹول پر خاموش بیٹھی تھی۔ اسے پانی اور بابا کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا۔ لیکن جب بابا نے چلا کر اسے بلایا تو وہ ایک دم اُٹھی اور زمین پر پاؤں رکھتے ہی ہڑبڑا گئی۔ بابا نے بتایا کہ باہر شدت کی بارش ہو رہی ہے اور پانی اندر گھسا چلا آتا ہے۔ اگر اس کا بندوبست نہ کیا گیا تو زمین پر پڑی ہوئی تمام چیزوں کو بہا کر لے جائے گا۔ جب انھوں نے باورچی خانہ سے باہر قدم رکھا تو پانی پنڈلیوں تک پہنچ چکا تھا۔ تب بابا نے کہا۔ ''نہر ٹوٹ گئی ہے۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ مسعود کو اُٹھا کر اصطبل بھاگ چلو۔''

مسعود کو جگا کر ایلن نے اُسے بابا کے کندھوں پر سوار کرا دیا اور خود الماری سے دو تین کمبل اُٹھا کر مرغی خانہ کو بھاگ گئی اور جب ٹوکرے میں چند مرغیاں اور ان کے بچے اُٹھا کر اصطبل میں پہنچی تو پانی اس کی بغلوں تک پہنچ گیا تھا۔ اسے اس بری طرح بھیگی ہوئی دیکھ کر بابا نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے نہر میل آدھ میل لمبی ایک طرف ہی ٹوٹ کر بہہ گئی ہے۔ لیکن تم کپڑے اتار دو اور کمبل لپیٹ لو۔''

ایلن نے ایک کمبل کونے میں بابا اور مسعود کے لیے بچھا دیا اور دوسرا اپنے گرد لپیٹ کر کپڑے اتارنے ہی لگی تھی کہ چتلی کے ڈکرانے کی آواز آئی وہ زور زور سے ڈکراتی ہوئی اصطبل کی طرف تیرتی آ رہی تھی۔ ایلن نے ایک دم کہا۔ ''بابا چتلی کا بچھڑا کھونٹے سے بندھا رہ گیا۔۔۔ تمھیں تیرنا آتا ہے؟''

بابا نے منہ پھاڑ کر کہا۔ ''نہیں''

ایلن کمبل پرے پھینک کر اصطبل سے باہر بھاگ گئی۔ اس کے پیچھے بابا کی دو تین آوازیں گونجیں لیکن وہ طوفانی رات کے اندھیارے سینے میں گھستی چلی گئی۔ چتلی اب بھی ڈکرا رہی تھی اور ایلن کو پانی میں تیرتے دیکھ کر اس کی آواز میں اور کرب پیدا ہو گیا تھا۔ بارش کی شدت کم نہ ہوئی تھی اور پانی سمندری لہروں کی طرح اُمڈتا چلا آ رہا تھا۔ ایسی اندھیری رات کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ وہ اندازے لگاتی عین اس جگہ پہنچ گئی۔ جہاں بہت سے بھنورے پیدا ہو رہے تھے۔ جب اس نے آگے بڑھنے کے لیے زور سے پاؤں مارا تو اس کا پنجہ بچھڑے کی تھوتھنی پر لگا۔ وہیں سے غوطہ لگا کر وہ کھونٹے تک پہنچ گئی مگر زنجیر نہ کھول سکی۔ دوسری مرتبہ زیادہ گہری ڈبکی مار کر اس نے پانی کے اندر ہی اندر زنجیر کھولی اور بچھڑے کو آزاد کر دیا۔

اتنا عرصہ پانی میں رہنے کے باعث اس کے عضاء شل ہو چکے تھے۔ مہیب اندھیرے میں اِدھر اُدھر چکر کاٹنے سے بالکل تھک گئی تھی اور اب اسے راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے ایٹھے ہوئے بازوؤں کو ہلا کر وہ جھیل عبور کی اور اصطبل کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ سارا لباس بھیگ کر شرابور ہو رہا تھا۔ بال مسلسل غوطوں کی وجہ سے کھل کر گردن کے اور چہرے کے اردگرد لپٹ گئے تھے۔ بابا اصطبل کے دروازے پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے اس میں آتے دیکھ کر اس نے غصّہ اور نفرت کے ملے جلے کلمات منہ ہی منہ میں بڑبڑائے

اور پھر اندر آ گیا چھوٹے سے دیے کی مدھم لو میں ایلن نے اپنے گرد لپیٹا اور بھیگے ہوئے کپڑے پرے کونے میں پھینک دیے۔ جب وہ دیوار کے ساتھ پیال کے ایک ڈھیر کو پاؤں ہموار کر کے لیٹ گئی۔ تو بچی اور بابا نے سر موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور دیر تک دیکھتے رہے بابا کا غصّہ آہستہ آہستہ فرد ہو رہا تھا اور جب تقریباً دو گھنٹے گذر گئے تو اس کا دل بالکل صاف ہو گیا۔ سر کے نیچے پڑی ہوئی پگڑی کی لپیٹوں کو کھول کر اس نے خشک حصّہ نکالا اور آہستہ سے ایلن کے سرہانے جا کر اس کے بھیگے ہوئے سر کو پونچھنے لگا۔ ایلن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ سو جائیں، بابا۔ میں ٹھیک ہوں، بال اپنے آپ خشک ہو جائیں گے۔'' مگر بابا نے کچھ نہ سنا اور سر کا ایک ایک بال پونچھنے میں لگا رہا۔ جب اس کا ہاتھ ایلن کے ماتھے کو لگا تو اس نے محسوس کیا اسے شاید بخار ہے۔

دن نکلا۔ نہر بند کر دی گئی اور پانی دُور دُور تک پھیل کر زمین میں جذب ہو گیا۔ دھوپ کی تمازت سے دم گھونٹنے والے بخارات پیدا ہوئے اور ایلن اصطبل میں آہستہ آہستہ کراہنے لگی۔ مسعود اپنے کمرے میں اپنے کھلونوں کو دیکھنے چلا گیا اور بابا ضروری ضروری چیزیں نیچے سے اُٹھا کر اپنے اصطبل میں لاتا رہا۔ تمام ٹرنک اور بستر رات بھر پانی میں ڈوبے رہے تھے۔ چارپائیاں تیر تیر کر دُور نکل گئیں تھیں۔ اور دودھ کی خالی گاگریں دو میل پرے ایک گاؤں کے راستہ میں چلی گئی تھیں۔ بابا نے کونے میں پڑا ہوا ایلن کا لباس اُٹھایا اور کنوئیں پر دھونے چلا گیا۔ کمالو اور اس کی بہن کا پتہ نہ ملا۔ اُن کا کوارٹر ڈھے چکا تھا اور اس کے ارد گرد مرغیاں مری پڑی تھیں۔

دودھ میں دار چینی اور الائچی اُبال کر بابا نے ایلن کو ایک گلاس بھر کر دیا مگر وہ دو گھونٹ سے زیادہ نہ پی سکی۔ چینی کی ایک چھوٹی سی تھالی میں اس نے سیب کا مربّہ ڈال کر دیا مگر اس نے آدھی قاش سے زیادہ نہ کھایا اور ہولے ہولے کراہتی اور جھوٹ موٹ مسکراتی پھر پیال پر لیٹ گئی۔

وہ بیمار تھی۔ مسعود اکیلا تھا اور گھر پر کوئی موجود نہ تھا۔ بابا شہر کس طرح جاتا اور کس کی مدد تلاش کرتا۔ دیر تک وہ اصطبل کے باہر بیٹھا یہی سوچتا رہا۔ مسعود ٹیلے پر چڑھتی ہوئی بیر بہوٹیاں جمع کر رہا تھا۔ اندر ایلن درد سے بے تاب ہو رہی تھی اور بابا اپنی سفید داڑھی کے بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سولجر بورڈ جائے، ہسپتال پہنچے، ساتھ کے گاؤں سے آدمی بلا کر لائے۔۔۔ مگر جائے کیسے؟ ایلن کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ جانا نہ چاہتا تھا اور قریبی گاؤں سے مدد نہیں مل سکتی تھی کیوں کہ سیلاب کی وجہ سے سارا گاؤں خالیہو گیا تھا۔ سورج غروب ہوتا جا رہا تھا اور پہاڑ سی رات سر پر کھڑی تھی۔ باورچی خانہ میں جا کر اس نے ایک انڈا ابالا، چائے تیار کی اور ایلن کے پاس لے آیا۔ خوشامدوں اور منتوں کے بعد اس نے تھوڑا سا انڈا کھایا اور ایک گھونٹ چائے پی کر ''بس بابا'' کہتی پھر اسی طرح لیٹ گئی۔

رات پھر بادل چھائے ہوئے تھے اور دُور کہیں بارش بھی ہو رہی تھی۔ بابا مرغی خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھا اصطبل کے روشندان میں ہلکی ہلکی روشنی دیکھ رہا تھا۔ تفکرات سے اس کے ماتھے اور گالوں پر جھریوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ اصطبل کی ڈھلوان چھت کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں پر زور دیا اور بھوؤں کے درمیاں بہت سی شکنیں ڈال کر اس نے سوچا۔ اگر ایلن کو کچھ ہو گیا تو۔۔۔۔ لیکن پھر اس نے فوراً اس منحوس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور اُٹھ کر آہستہ آہستہ اصطبل کو چلا۔ دروازے کے باہر پہیوں

والے کھٹولے میں مسعود سو رہا تھا اور اس کے نیچے بطخیں اور مرغیاں بیٹھی تھیں۔ دہلیز پر اجالا کی لگام پڑی تھی۔ بابا نے آہستہ سے اُسے اٹھایا اور پھر کھونٹی پر ڈال دیا۔ اندر دونوں گھوڑے منہ اٹھائے خاموش کھڑے تھے اور اپنے کانوں کو ہر آنے والی آہٹ کی طرف تیزی سے پھرا رہے تھے۔

پیال کے بہت سے تنکے ایلن کے بالوں اور گالوں پر چپکے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ بابا نے مسعود کا کھٹولا ہولے سے دھکیل کر اندر کر دیا۔ کھونٹی سے لگام اتاری۔ اجالا پر زین کسی اور رات کے اندھیرے میں اس پر سوار ہو کر شہر روانہ ہو گیا۔ مرغیاں ککرائیں، بطخوں نے جھک جھک کی اور پھر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔

کوئی نرس، ڈاکٹر یا سسٹر اس کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ بابا نے کہا۔ ''میں بہت دکھیا ہوں، میرا ایک ہی بیٹا ہے اور اس کی بیوی اس کی زندگی کا واحد سہارا ہے۔ خدا کے لیے میرے ساتھ چلو۔ میں پرممکن طریق سے آپ کی خدمت کروں گا۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ مجھ پر اعتبار کیجیے۔ میں ایسا آدمی نہیں۔ میں پچھلی جنگ میں ہر محاذ پر لڑ چکا ہوں۔ میرا بیٹا بھی فوج میں ہے۔ آپ مجھ پر اعتماد کریں۔ گھر چل کر میں آپ کو اپنا ڈسچارج سرٹیفکیٹ اور انگریز افسروں سے ملی ہوئی چال چلن کی چھٹیاں دکھاؤں گا۔ خدا کے لیے میرے ساتھ چلیے۔''

مگر سب نرسیں ہنسنے لگیں۔ ایک نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ ''بابا ہمیں تمھارے چال چلن پر اعتبار ہے۔ لیکن ہم لوگ یہاں سے باہر نہیں جا سکتے اور اگر جانا بھی ہو تو اس پر بیٹھ کر ہرگز نہیں۔'' اس نے اجالا کی طرف اشارہ کیا اور تیزی سے آنکھیں جھپکنے لگی۔

بابا نے کہا۔ ''آپ کوئی موٹر لے لیجیے۔ ٹیکسی لے لیجیے۔ میں کرایہ ادا کروں گا۔ دوگنا کرایہ دوں گا۔ آپ کو دس گنا فیس دینے کا وعدہ کرتا ہوں مگر میرے ساتھ ضرور چلیے۔ میری بہو کو بچا لیجیے۔''

''نا بابا نا۔'' دو تین نرسوں نے تک زبان ہو کر کہا۔ ''جب ڈاکٹر لوگ نہیں جاتے تو ہم کیا کریں۔'' پھر اسی نرس نے کہا۔ ''بابا اپنی بہو کو جا کر دم کرو۔ اچھی ہو جائے گی۔'' اور ساری نرسیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

اندھیری وادی میں اجالا کو دوڑاتے ہوئے ایک آنسو کرن کی طرح اس کی آنکھ سے لپکا اور داڑھی کی سفیدی میں جا ملا۔

واپس پہنچ کر وہ گھوڑے کی پیٹھ سے کود کر اچھلا اور اصطبل کی گھاٹی پر تیز تیز چڑھنے لگا۔ اندر جا کر اس نے دیکھا کہ پیال کے اور تنکے ایلن کے بالوں اور گالوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اپنی ایک مٹھی گلے کے پاس بھینچ رکھی ہے اور سانس کی دھونکنی چلنی بند ہو چکی ہے۔ بابا نے دوزانو ہو کر اس کی ناک سے کان لگایا۔ کوئی آواز نہ تھی۔ اس کا ماتھا چھوا جو برف کی طرح یخ تھا۔ بابا کو محسوس ہوا جیسے بہت سی سسکیاں اور آہیں کمرے میں گھوم رہی ہوں۔ جن میں بابا، بابا کی پکاریں کثرت سے ہیں۔ اس نے بڑی نرمی سے ایلن کی مٹھی کو کھولا۔ سونے کی بھی سی صلیب مدھم روشنی میں جگمگانے کی کوشش کرنے لگی۔ جب بابا اس کے ابریشمی بالوں اور ساٹن ایسے ملائم چہرے سے پیال کے تنکے چن رہا تھا تو اجالا خاموشی سے اندر داخل ہوا اپنے تھان پر جا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

رات رات میں بابا نے خود ہی قبر تیار کی اور ایلن کو اسی کمبل میں لپیٹ کر لحد میں اتار دیا۔ پھر دیا اٹھا کر مسعود کی کھاٹ کے پاس

زمین پر بیٹھ گیا اور تلاوت کرنے لگا۔

صبح جب مسعود نے پوچھا۔ ''ممی کہاں ہے؟'' تو بابا نے جواب دیا کہ۔ ''تمھارے ڈاڈا آئے تھے اور ممی کو ساتھ لے گئے ہیں۔اب وہ اگلے مہینے دونوں اکھٹے آئیں گے۔''

مسعود بسورنے لگا کہ۔ ''ڈاڈا آئے تھے تو مجھے کیوں نہ جگایا۔ممی کو اکیلے کیوں جانے دیا۔مجھے ساتھ لے کر کیوں نہ گئے۔'' اور جب بسورنے سے رونے پر اتر آیا تو بابا نے اسے اٹھا کر کندھوں پر بٹھالیا اور بولا۔ ''چل تجھے چڑیا پکڑ دوں۔''

''جلدی کرو! جلدی کرو!'' سپاہی نے ایک بڑھیا کی کمر میں رائفل سے زور کا ٹھوکا دیا۔اور اس کے سر پر رکھی ہوئی ٹرنکی آہستہ آہستہ ٹین کو ایک چپٹا ٹکڑا بن گئی۔۔۔۔

دکانوں کے تالے ٹوٹے پڑے تھے اور بہت سے کواڑوں کو قلابوں سے اکھیڑ لیا گیا تھا۔دکانوں کے اندر اور باہر خالی ڈبوں اور بوریوں کے انبار لگے تھے۔اندر اندھیرا تھا اور باہر مٹیالی گرد سگریٹ کے دھوئیں کی طرح بل کھاتی سورج کے گرد منڈلا رہی تھی۔۔۔۔خاک کے ذرات چنگاریوں کی طرح گرم اور نیزے کی انیوں کی طرح نوکیلے، پسینے سے تر جسموں میں نشتروں کی طرح اترتے چلے جا رہے تھے۔اس پر رائفلوں کی سیٹیاں بجاتی گولیاں اور سٹین گنوں کی تڑ تڑ کرتی باڑھیں! انسان تھے سانس روکے سب برداشت کرتے گئے۔بچے پیاس کی شدت سے چلا رہے تھے۔ان کی ماؤں کا ایک ہاتھ ان کے منہ پر بھنچا ہوا تھا۔دوسرا برقعہ سنبھال رہا تھا۔

تیزی! تیزی!! تیزی!!! بندقوں کے فائر تیز۔کوٹھوں سے اینٹوں کی بارش تیز اور گالیوں کی بوچھاڑیں تیز۔مشرقی پنجاب سے مہاجروں کا یہ قافلہ سڑک میں گٹھڑیاں، ٹرنک، جوتے، برقعے اور بٹوے بوتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ایک سفید رنگ کی بوٹا سی لڑکی سر پر سیاہ ٹرنک اُٹھائے ہانپتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔خوف اسے تیز قدم اُٹھانے پر مجبور کر رہا تھا۔پہلی مرتبہ یوں ننگے سر ننگے منہ بازار چلنے کا احساس دل کی تیزی کے ساتھ ساتھ نتھنوں کے اتار چڑھاؤ میں عجلت پیدا کر رہا تھا۔

جانے پہچانے بلوائی نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ''تیرے صدقے جاؤں، کتنا بھاری ٹرنک اُٹھا رکھا ہے۔۔۔۔جانی ایسا بھی کیا۔لا یہ ٹرنک مجھے دے۔دیکھ تیری چھاتیاں تالیاں بجا رہی ہیں۔''

لڑکی لڑکھڑائی، ٹرنک کا کونا اس کی کنپٹی میں لگا۔خون کے قطرے ایک دوسرے کے پیچھے سرعت سے بھاگنے لگے۔

''ہائے ہائے!'' بلوائی نے سر جھلا کر کہا۔ ''یہ ناریں بھی کسی بلور سے بنی ہیں۔ذرا سا بال آ گیا۔اور مالٹا مٹھ کی بوتل کی طرح چھلکنے لگا۔ہائے رسیلی۔رس بھری۔'' اور پھر وہ اپنے ہونٹ چاٹنے لگا۔

بابا مسعود کو پیٹھ پر لادے جلدی جلدی قدم اُٹھا رہا تھا۔پسینہ کے قطرے اس کی سفید داڑھی سے ٹپکنے لگے۔مسعود کے لٹکتے ہوئے پاؤں اس کی چرچراتی ہڈیوں سے ٹکرا رہے تھے اور وہ بوڑھے اُونٹ کی طرح تھل تھل کرتا بھاگ رہا تھا۔دوڑ ختم نہ ہوتی تھی۔راستہ کٹ نہیں رہا تھا اور اس کا سرخ و سپید پوتا ہولے ہولے رو رہا تھا۔سبز رنگ کا کوٹ پہنے، نیلی نیلی آنکھوں والا فرنگی باوا اس کا باپ العرفہ کے کیمپ پوسٹ آفس سے تار بھجوا رہا ہوگا اور اس کا بابا اپنے خاندان کی واحد امانت کو اپنے بوڑھے کندھوں پر اُٹھائے لیے جا رہا تھا۔جن کو دشمنوں کی

سنگینوں نے کئی مرتبہ چوما تھا۔

پلیٹ فارم پر بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی مگر گاڑی نہ آئی۔ بلوائیوں کا ایک گروہ نیزے چمکاتا اور بلمیں گھماتا اسٹیشن کے پہلو سے گذر گیا۔ ان میں سے بہت سے گا رہے تھے، بہت سے گالیاں دے رہے تھے اور باقی بوک بکروں کی طرح آوازیں نکال رہے تھے۔ عورتیں زانوؤں میں سر دے کر بیٹھ گئیں اور مرد آنکھیں موند کر کھڑے ہوگئے۔ روشنی میں کچلے کا غبار سا تیر رہا تھا اور افق کے پاس نارنجی رنگ میں اجلی اجلی آگ کروٹیں لے رہی تھی۔

مسعود نے کہا۔ ''بابا پیاس لگی ہے۔''

بابا نے چمکار کر کہا۔ ''ابھی پلاتے ہیں پانی، گاڑی آئے گی تو پانی ملے گا۔''

''گاڑی کب آئے گی بابا؟''

''ابھی آئے گی۔'' اس نے مسعود کو اپنی گود میں بٹھالیا اور اس کے سنہرے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

ایک اور ہجوم بجرنگ بلی کے نعرے لگا کر فارم کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر پہلا گروہ پلٹ آیا۔ کسی کے حکم کا انتظار نہ تھا۔ چیخیں گونجیں، شور اٹھا، آسمان لرزنے لگا اور نارنجی روشنی میں اضافہ ہوگیا۔ کوئی جھاڑیوں کو بھاگا۔ کسی نے مکانوں کا رخ کیا۔ بہت سے دریا کو دوڑے اور جو باقی تھے وہ کٹنے لگے۔ خون کی چکناہٹ سے سپاہیوں کے قدم اچھی طرح جم نہ سکتے تھے اور ان کے لوہے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر اٹھتے تھے۔ دریا کے پاس زمین اب بھی پھسلنی تھی اور مخالف ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ لیکن ان کے ارادے مضبوط تھے۔ ہاتھ شل ہو چکے تھے پر جذبہ جوان تھا۔

مسعود ریلے کی ٹھوکر سے بنچ کے نیچے جا گرا اور اس کا سر لوہے کے ایک بڑ پیچ سے بری طرح ٹکرایا۔ بابا کے پرشکن ماتھے پر ایک اور گہرا نشیب نمودار ہوا۔ اس کی سفید داڑھی کو پھر حنا کی اور وہ فرش پر لیٹ گیا۔ اس کی کمر کو ایک بار پھر سنگینوں نے چوما اور اس کے کندھوں سے بہت سے بوسے چمٹ گئے۔ تاریکی پھیل گئی۔ پلیٹ فارم پر خاموشی چھائی اور تیز ہوا چلنے لگی۔ شیشم کے درخت خاموشی میں سرسرائے۔ فوجیں جا چکی تھیں۔ انھیں شبخون سے نفرت تھی اور گوریلا لڑائی ان کے نزدیک بے حد برا فعل تھا۔۔۔ سارا دشمن کھیت رہا تھا۔ اس کی عورتیں سپاہی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔۔۔ دور سگنل کی سبز آنکھ جگمگا رہی تھی۔ شیشم کے درخت سے ہٹر ہٹر کرتا ایک الّو تاروں میں الجھتا دُور کھیتوں کی طرف اڑ گیا۔ کرفیو لگ چکا تھا اور آوارہ کتے ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے۔ اس مسلسل سکوت میں ایک ہلکی سی گونج تھی جو سوئے ہوئے عضو کی طرح جھنجھنا رہی تھی۔

مسعود بنچ کے نیچے سے نکلا۔ اس کے پاس بہت سے آدمی لیٹے تھے اور انہی میں ایک اس کا بابا تھا۔

''مجھے پیاس لگی ہے، بابا۔'' اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

''۔۔۔۔۔۔۔۔''

''مجھے پیاس۔۔۔'' پھر اس نے اپنے بابا کا کندھا ہلایا۔ پر وہ نہ بولا۔ ویسے ہی لیٹا رہا۔ ''بابا! بابا!'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''مجھے

پیاس لگی ہے، بابا۔"

دُور کہیں بندوق دغی اور اس کی ٹھائیں دیر تک قہقے مارتی رہی۔ وہ دبک کر اپنے بابا کے پاس بیٹھ گیا۔ سارے آدمی چپ چاپ سو رہے تھے۔ پلیٹ فارم کے پرلے کونے پر ایک زرد بلب جل رہا تھا۔ ریلوے لائن مرے ہوئے اژدہوں کی طرح بے حس لیٹی تھی۔ تیز ہوا سسکیاں بھرنے لگی تھی اور وہ خاموش اپنے بابا کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ سبز رنگ کا کوٹ پہنے نیلی نیلی آنکھوں والا فرنگی۔ اس کا باپ دُور تھا۔ اس کی ممی بہت دُور اور اس کا بابا اور بھی دور۔ ذرا جھک کر اس نے اپنے بابا کو دیکھا اور دیکھتا چلا گیا۔ اس ڈآڈا رات ہی رات میں اس کی ممی کو لے گیا تھا۔

۔۔۔۔۔ بابا بولتا نہیں تھا اور اس کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔

پناہیں

ٹوکن ہاتھ میں لے کر بوڑھا بنچ پر بیٹھ گیا۔ ابھی چیک پاس ہونے میں کافی دیر تھی۔ چونکہ چار ہندسوں کا چیک بنک کے ہر میز پر گھوم کر خزانچی کے پاس پہنچتا ہے۔۔۔۔۔۔اس نے چوبیس نمبر کا چیک واسکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ گھٹے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا کہ اگر آصف ساتھ ہوتا تو کام کتنی جلدی ہو جاتا اور اگر کام جلدی نہ بھی ہو سکتا تو اس دوران وہ باتیں کر کے ہی وقت گذار لیتے اور آصف اس کے ساتھ جبھی آ سکتا تھا اگر شام ذرا جلدی چھا جاتی یا وحید کوٹھے کی اوٹ سے سر نکال کر نہ دیکھتا اور وحید ہرگز اونچا ہو نہ دیکھتا اگر شور اچانک بند نہ ہو جاتا۔ اگر عقل اس وقت اس کا ساتھ دیتی تو آصف یقیناً اس وقت بنک کے بنچ پر بیٹھا ہوا ٹوکن نمبر چوبیس کے چیک کی رقم کا انتظار کرتا۔ وحید نے غلطی کی تھی۔ لیکن اگر آصف اس وقت یہاں ہوتا تو ان کے پاس یہ ٹوکن ہی نہ ہوتا!

بوڑھے کی تابوت ایسی آنکھوں میں وہ راتیں سائیں سائیں کر گھومنے لگیں جب ہرکین کی روشنی میں اناج والی کوٹھڑی کے اندر تین سائے خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے۔ ایک چاقو سے کارتوسوں کو چھیل کر بارود اور گولیاں الگ کرتا، دوسرا کارتوسوں کا بارود ایک میں ڈال کر پنکھی کی ڈنڈی سے کوٹتا، پھر خاکی تھیلے سے سیسہ کی ایک گولی نکلتی اور اس کارتوس میں اتار دی جاتی۔ گتے کی گول ٹکیہ منہ بند کرتی اور اوپر لئی لگا کر پتنگی کاغذ منڈھ دیا جاتا۔ اس پرسکون سازش میں تیسرا سایہ کاپی کی جلد سے آہستہ آہستہ ان دونوں کو ہوا کیے جاتا یا ان دونوں کی کنپٹیوں سے رستے ہوئے پسینہ کے قطرے کو اپنی سیدھی انگلی پر اُٹھاتا اور ہاتھ اُونچا کر کے انگوٹھے کی مدد سے ہوا میں یوں اچھال دیتا جیسے طلسماتی بلور ہتھیلی پر دھرے دھرے ایک دھماکے سے کرچی کرچی ہو گیا ہو اور اگر امسی ہوئی خاموشی ان کے سانسوں کی آواز کو بھی مفلوج کر دیتی تو یہی تیسرا سایہ کوئی تازہ بھرا ہوا کارتوس اُٹھا کر کہتا۔ ''بیٹا آصف! شاید اس میں گولی ڈالنا بھول گئے۔'' اس طرح اس قبرستانی سکوت میں ذرا سا ارتعاش پیدا ہو جاتا جیسے خرابے کی ڈھیری پر سگنل کی سرخ آنکھ سے کوئی الوّ ہُٹر ہُٹر کر کے اڑ گیا ہو۔ آصف بڑی سنجیدگی سے وہ کارتوس وحید کے آگے لڑھکا دیتا اور خود کھڑے زانو سے منہ کا پسینہ پونچھ کر گولیاں گننے لگتا۔ جب یہ کام ختم ہو چکتا تو وہ تینوں گندم کی ایک بوری سرکا کر سارا مواد اس کے پیچھے ڈال دیتے اور خود کپڑے جھاڑ کر باہر نکل آتے۔ دروازہ بند ہو جاتا۔ ہرکین کا شعلہ لحد میں اتر جاتا اور وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتے باہر صحن میں پہنچ جاتے جہاں کچھ تو گھوک سوئے ہوتے اور باقی آخری کروٹیں بدل رہے ہوتے۔

وہ دن بھی آ گیا جب بوریوں کو ایک طرف ہٹا کر سب کارتوس نکالے گئے انھیں مختلف تھیلوں میں ڈال کر تقسیم کر دیا گیا۔ تین تھیلے وحید اپنے گھر لے گیا۔ دو تھیلے لے کر الہٰ دین بڑ کی اوٹ میں طویلے کی چھت پر لیٹ گیا اور جدھر آموں کے جھنڈ تھے ادھر ریت کی دو بوریاں رکھ کر آصف نے اپنا مورچہ بنا لیا۔ وحید اپنے کوٹھے۔۔۔ پر سیڑھیوں والی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے چوٹھا نہیں مار رہا تھا۔ یہ قدرتی ناکہ بندی سب سے اچھی رہی۔

حملہ بارہ بجے شروع ہوا۔ یلغار کرنے والی فوجیں آموں کے جھنڈ سے نمودار ہوئیں۔ ان میں سے بیشتر گھوڑوں پر سوار تھے جن کے پاس بندوقیں اور رائفلیں تھیں۔ باقی بلموں، نیزوں اور تلواروں سے مسلح نعرے مارتے چلے آتے تھے۔ گاؤں کو اس طرح دیکھ کر انھوں نے شاید یہی اندازہ لگایا کہ رہنے والے بھاگ گئے۔ مگر جب سامنے منڈیر پر رکھی ہوئی بوریوں میں سے ایک گولی لپکی اور سامنے والے

سوار کا بھیجا چاٹتی نکل گئی تو طوفان مچ گیا۔ جوابی فائر ہوئے۔ نعروں کی آواز میں توپوں کی گرج پیدا ہوگئی اور ٹاپوں کی دھول سے بہت سے ہندوکش ایستادہ ہوگئے۔ لیکن ہر مرتبہ انہی کا کوئی سوار یا پیادہ ڈھیر رہا۔ کلمہ کی صدائیں گونجیں۔ خوفزدہ نعرے سیلابے پٹاخوں کی طرح پھٹے اور عرش وفرش گویا کانپنے لگے۔ دھوپ کی تمازت میں بھی چہرہ سرسوں کا پھول بنتا جا رہا تھا اور سورج کی شعلہ باری کانپتے ہوئے جسموں کو کنکنی پھوار معلوم ہوتی تھی۔

کچھ حملہ آور کنی کترا کر طویلے کی طرف گئے۔ آصف نے الہٰ دین کو للکارا بڑ سے فولادی بڑ دلیاں ٹپکیں اور حملہ آور حلال خوروں کی جھونپڑیوں کے پیچھے چھپتے چھپاتے وحید کی زد میں آ گئے۔ دیوار کے پیچھے دو نالی کا پھن اٹھا اور کالے نے آگے پیچھے دو من اگل دیے۔ دھول کی دیوار بلند ہوئی اور جوگیوں نے بھی اگن بان پھینکنے شروع کیے جو دیوار سے سر پھوڑ پھوڑ کر رہ گئے۔

آصف کی بندوق متواتر دغنے سے اتنی گرم ہوگئی تھی کہ کارتوس مشکل سے بھرتا اور بڑی قباحت سے گھوڑا دبا دیا جاتا۔ ادھر بڑ کے پتے بارش کی طرح برس رہے تھے۔ صرف وحید آہستہ سے نالی پھیرتا اور اطمینان سے سر دیوار سے ٹیک کر داغ دیتا۔ جب کافی دیر تک ادھر سے کوئی جوابی فائر نہ ہوا تو وحید نے آگے بڑھ کر دیوار کی اوٹ سے جھانکا۔ اس کی نگاہ پڑنے سے پہلے ایک گولی نے اس کی کنپٹی کو چوما اور وہ بغیر کوئی آواز نکالے اسی جگہ لیٹ گیا۔ آصف نے گولی کی یہ انوکھی آواز سن کر سر ادھر پھیرا اور اپنے پاس لیٹے ہوئے بوڑھے سے کہنے لگا۔ ''ابّا آپ یہاں آ جائیں۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔'' اس نے وحید کے مورچے کی طرف اشارہ کیا۔

''لیکن وحید۔۔۔۔۔'' اس کے باپ نے ایسے ہی لیٹے لیٹے ادھر آنکھیں گھما کر دیکھا اور پھر فقرہ ادھورہ چھوڑ دیا۔

رینگتے رینگتے وہ چھتوں پر سے ہوتا ہوا ادھر پہنچا۔ مگر وحید کے کوٹھے پر چڑھ ہی رہا تھا کہ اسے دروازہ ٹوٹنے کی آواز آنے لگی۔ دیوار چھائے ہوئے نیم کے سہارے لٹک کر وہ صحن میں کود گیا۔ وحید کا باپ جو برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے دروازے ٹوٹنے کا انتظار کر رہا تھا اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور شدت سے کانپنے لگا۔ آصف نے اُسے کلائی سے پکڑ کر کھینچا اور گائے کی کھرلی کے پاس لے گیا۔ جس کے نیچے مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ تنگ دروازے سے اندر دھکیل کر آصف نے اس کے آگے تختی ڈال دی۔ دروازہ ٹوٹ گیا اور وہ اچھل کر غسل خانہ میں جا چھپا۔ دوسرے مورچے بھی ٹوٹ گئے جو چیخیں پہلے آسمان میں شگاف کیے جاتی تھیں۔ اب موت سامنے دیکھ کر تھم گئیں۔ البتہ لوہے سے لوہا بجنے کی صدا بہت بلند ہوگئی تھی۔ شاید حملہ آوروں کے اپنے ہتھیار آپس میں الجھ رہے تھے۔ آصف کے گھر میں جمع ہوئے لوگ پچھلے دروازے سے نکل بھاگے اور آموں کے جھنڈ کے پاس لہلاتی مکئی کے کھیت میں چھپ گئے۔ بوڑھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مکئی کے ٹانڈوں کو الگ کر کے دُور تک دیکھا مگر آصف کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وحید کا باپ جب رات کو ڈربے سے نکل کر بھاگا تو اس نے غسل خانے میں پڑی ہوئی ایک لاش کو دیکھا ضرور مگر وہ اسے پہچان نہیں سکا۔ لیکن آصف ابھی واپس بھی نہیں آیا تھا اور بوڑھا آج تک اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔۔۔۔۔ پر یہ سب کچھ وحید کی وجہ سے ہوا۔ اگر وہ کوٹھے کی منڈیر سے سر نکال کر نہ دیکھتا اور اگر شور بدستور جاری رہتا۔ اگر الہٰ دین بہت سے آدمیوں کو مار دیتا یا اگر شام ذرا جلدی ہو جاتی تو آصف بھی بچ کر مکئی کے کھیت میں پہنچ جاتا۔ لیکن اگر اس کی ماں دور اندیش عورت ہوتی تو وہ اسے عید پر بلاتی ہی کیوں۔ دوسرے بچوں کی طرح اُسے بھی مغربی پنجاب میں ہی رہنے دیتی۔ لیکن اگر وہ ساری عمر اپنی ماں سے

دُور دور نہ رہتا تو یقیناً وہ اسے عید پر نہ بلواتی۔ بار بار یہی خیال بوڑھے کے ذہن میں ایک اپاہج کی طرح ناچ رہا تھا۔

اس نے دیکھا: آصف ہسپتال کی میز پر بیٹھا ٹانگیں جھلا جھلا کر تختی پر پہاڑے لکھ رہا ہے۔ ایک دونی دونی، دو دونی چار اور جب وہ ڈوبا لینے کے لیے دوات میں قلم ڈالتا تو ہندسوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اور لے سے پاؤں کی تال ملا کر دیر تک قلم دوات میں ہاون دستہ کا کھیل کھیلتا رہتا۔

اپنی بیوی سے بوڑھے کے تعلقات کچھ اتنے خوشگوار نہیں تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی نارضامندی کی شادی کا ایک تلخ ردِعمل تھی۔ بوڑھا ایک کامیاب سلوتری تھا لیکن وہ ایک ناکام خاوند! شادی سے لے کر آج تک اس کی بیوی کبھی ایک سال سے زیادہ اس کے پاس نہ رہ سکی۔ بیٹھے بٹھائے کوئی نہ کوئی ایسی بات چل نکلتی کہ فوراً تانگہ منگوایا جاتا اور بیگم صاحبہ کھڑے پاؤں میکے پہنچ جاتیں۔ بچوں کو بھی اپنے باپ سے وہ الفت نہ رہی تھی۔ پھر اٹھتے بیٹھتے ماں کے منہ سے ابا کے خلاف ایسی باتیں سنتے انھیں اور بھی یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ان کے کچھ بھی نہیں لگتے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب بھی دن بھر مویشیوں سے سر پھوڑ کر شام کو آرام کرسی میں لیٹ کر اخبار پڑھتے ہوئے ہولے ہولے حقہ بجانے لگتے اور سوائے اپنے گھر کے دنیا کے ہر حصہ کا جائزہ لیتے رہتے۔ ایسی ہی ایک شام رحیم بخش نے ہسپتال میں داخل شدہ گھوڑوں پر کھریرا کر کے پگڑی کے پلو سے منہ صاف کیا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس آ کر کھنکار کر بولا۔

''ڈاکٹر صاحب، چار دن کی چھٹی چاہیے۔''

''چار دن کی چھٹی!'' ڈاکٹر صاحب نے اخبار پر نظریں گاڑے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں خیر تو ہے؟''

''گھر جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب۔''

''گھر جاؤ گے؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہاں کیا رکھا ہے؟''

''عید آ رہی ہے، ڈاکٹر صاحب۔۔۔ اور بال بچوں سے پرے عید کون مناتا ہے جی۔''

''اچھا! اچھا! چلے جانا۔۔۔ لیکن۔۔۔ اچھا چلے جانا۔'' ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے کہا اور تیزی سے حقہ بجانے لگے۔

انھیں بچوں سے ملے تیسرا سال جا رہا تھا۔ تنخواہ ماہ بماہ بھجوا دیتے لیکن خود کبھی نہ گئے نہ خط لکھا۔ سر شام ہی سونے کی عادت تھی۔ اس لیے بال بچوں کی یاد کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اب رحیم بخش نے جو بات کہی تو ڈاکٹر صاحب کو ایک دم سارے لوگ یاد آ گئے اور وہ دیر تک اخبار زانو پر ڈالے ان کے متعلق سوچ سوچ کر ساکت ہوتے گئے۔

رحیم بخش کی عرضی منظور ہو گئی اور ڈاکٹر صاحب خود بھی کمپاؤنڈر سے یہ کہہ کر روانہ ہو گئے کہ عید کے بعد آوں گا۔

آصف اب چار برس کا تھا۔ وہ دوسرے بھائیوں کی طرح ابا سے خائف نہیں ہوا۔ جتنے دن وہ یہاں رہے یہ سایہ کی طرح ان سے چمٹا رہا۔ چلتے وقت رونے لگا کہ میں بھی ابا کے ساتھ جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب رضامند ہو گئے۔ اس ماں نے بھی مزاحمت نہ کی۔ کرتی بھی کیسے جو بچہ باپ پر اس قدر التفات کرتا ہو وہ اس کی پارٹی کا کیسے ہو سکتا تھا۔

ہسپتال پہنچ کر آصف بہت خوش ہوا۔ دن بھر طرح طرح کے مویشی دیکھتا، ان کی بے ہنگم آوازیں سنتا اور اپنے ابا کو اتنا سارا خون